ریشمی جوڑا
حسین ذکی کاظمی

ریشمی جوڑا

حسن ذکی کاظمی

نونہال ادب

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس کراچی

مجلسِ ادارت

سعدیہ راشد　　مسعود احمد برکاتی　　رفیع الزّماں زبیری

ناشر	:	ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان
		ناظم آباد کراچی ۷۴۶۰۰
طابع	:	معز پروسس
اشاعت	:	۲۰۰۲ء
تعداد اشاعت	:	۱۰۰۰
قیمت	:	۲۰ روپے

نونہال ادب کی کتابیں "نہ نفع نہ نقصان" کی بنیاد پر شائع کی جاتی ہیں۔

ریشمی جوڑا

بیگم صاحبہ برآمدے میں بیٹھی ہوئی اپنی بہو سے باتیں کر رہی تھیں اور گرم گرم چائے کے مزے بھی لیتی جا رہی تھیں۔ بہو ابھی دو دِن پہلے لندن کی سیر کر کے لوٹی تھی اور ساس کو وہاں کے قصّے سُنا رہی تھی۔ وہاں کیا کیا دیکھا۔ کِس کِس سے ملی۔ کِیا کِیا خریدا۔ وغیرہ وغیرہ۔ باتیں کرتے کرتے بہو نے کُرسی کے پاس رکھا ہوا پلاسٹک کا تھیلا اُٹھایا اور بولی :

"امی! میں نے آپ کے لیے لندن میں یہ سِلک خریدی تھی شلوار قمیص کے لیے۔ یہ ہے اِس کا دوپٹہ اور یہ اِس رنگ سے ملتا جُلتا سوئٹر۔"

بیگم صاحبہ نے اِن چیزوں کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "بے حد خوب صورت ہیں ساری چیزیں۔ رنگ بھی بڑے پیارے ہیں۔ لیکن بیٹی تُم نے یہ تکلّف کیوں کیا۔ بھلا یہ میری عُمر ہے اتنی مہنگی چیزیں پہننے کی۔"

"امّی اچھّے لباس کے لیے عُمر کی کوئی قید نہیں۔ بس آپ اِسے فوراً سِلوا لیجئے۔ عید پر آپ یہی جوڑا پہنئے گا ورنہ میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گی۔" بہو نے مُسکرا کر کہا۔ "اللہ تمھیں سلامت رکھے۔ تمہارا سہاگ قائم رہے۔ بچّوں کی خوشیاں دیکھو۔" ساس نے محبّت سے بہُو کے سر پر ہاتھ رکھا اور دُعائیں دینے لگیں۔

چار پانچ دِن گُزر گئے۔ بیگم صاحبہ کمرے میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھیں کہ انہیں حمیدہ کی آواز نے چونکا دیا۔ "بیگم صاحبہ! آج گوشت میں کون سی

سبزی ڈالوں؟"

بیگم صاحبہ نے اخبار پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا۔ "حمیدہ! میں نے دس بار کہا ہے کہ کھانے کے بارے میں بہُو سے پُوچھا کرو لیکن بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔"

" بیگم صاحبہ! میری مُصیبت یہ ہے کہ آپ سے پوچھتی ہوں تو آپ بہُو بیگم کی طرف بھیجتی ہیں اور اُن کے پاس جاتی ہوں تو وہ کہتی ہیں امّی سے پوچھو۔ " حمیدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھّا سبزی کا بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے اِدھر آ میرے پاس۔ ذرا میرا یہ بازُو دبا دے۔ بہت درد ہو رہا ہے۔ " بیگم صاحبہ نے مُسکرا کر کہا۔

حمیدہ نے بیگم صاحبہ کا بازُو دبانا شروع کیا اور ساتھ ساتھ دونوں میں باتیں ہونے لگیں۔ بیگم صاحبہ بولیں۔ "حمید تمہاری بیٹی کیسی ہے؟ کئی دِن سے

دِکھائی نہیں دی۔ کیا ناراض ہے ہم سے؟"

"توبہ توبہ۔ بیگم صاحبہ اُس کی کیا مجال کہ آپ سے ناراض ہو۔" حمیدہ نے گھبرا کر کان چھُوتے ہوئے کہا۔

"تو پھر آتی کیوں نہیں میرے پاس؟" بیگم صاحبہ ہنستے ہوئے بولیں۔

"بس بیگم صاحبہ وہ امتحان سر پر آ گئے ہیں نا۔ دِن رات پڑھتی رہتی ہے۔ اور ہاں آپ کو بتانا یاد نہیں رہا۔ وہ جو رشتہ آیا تھا بیٹی کا، وہ لوگ عید کے دِن بات پکّی کرنے آ رہے ہیں۔ میں سوچتی ہوں رشتہ اچھّا ہے۔ بات پکّی ہو ہی جائے۔"

"ٹھیک سوچا ہے تُم نے۔ لیکن کُچھ تیّاری بھی کی؟" بیگم صاحبہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

" بیگم صاحبہ ہم غریبوں کی تیّاری ہی کیا۔ یتیم بچّی ہے۔ باپ کا سایہ سر پر

ہوتا تو کُچھ تیّاری بھی ہو جاتی۔ سوچا ہے ایک اچھّا بُرا جوڑا سِلوا دوں گی اُس دِن پہننے کے لیے اور رشتہ والوں کو چائے پلا دوں گی۔" حمیدہ ٹھنڈا سانس بھر کر بولی۔

"لو بس اب کام کرو۔ چین آ گیا۔ اللہ تمہیں جیتا رکھّے۔ ایسا کرو کہ گوشت میں لوکی ڈال دو اور ہاں بچّی کا جوڑا بنانا تو مُجھ سے مشورہ کر لینا۔" بیگم صاحبہ نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

حمیدہ مُسکراتی ہوئی باورچی خانہ کی طرف چلی گئی۔

رمضان اپنی برکتیں بانٹا ہوا آیا اور جانے بھی لگا۔ اب ہر طرف عید کی تیاری تھی۔ گھروں میں رنگ روغن اور صفائی ہو رہی تھی۔ بازاروں کی رونق چار گُنا ہو گئی تھی۔ دُکانیں سجی ہوئی تھیں۔ روشنیوں کا سیلاب تھا۔ راستہ چلنا مُشکل ہو گیا تھا۔ درزیوں کو تو لمحے بھر کی فُرصت نہ تھی۔ اُنتیسواں روزہ ختم ہوا تو بے چینی سے چاند کا انتظار ہونے لگا۔ اُنتیس کے

چاند کا مزا ہی کُچھ اور ہوتا ہے۔ لو چاند نظر آ گیا۔ گولے اور پٹّاخے داغے گئے۔ پورا محلّہ مبارک سلامت کے شور سے گُونج اُٹھا۔ خوشیاں بکھرنے لگیں۔

عید کی صُبح نماز کے بعد پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں نے بیگم صاحبہ اور اُن کے شوہر کو گھیر لیا اور عیدی کا تقاضہ ہونے لگا۔ تھوڑی دیر میں بیٹا اور بہو بھی سلام کرنے آئے۔ بہو نے بیگم صاحبہ کو دیکھتے ہی کہا۔ "امّی میں نہیں بولوں گی آپ سے۔ میں سخت ناراض ہوں۔ آپ نے وہ میرا لایا ہوا جوڑا کیوں نہیں پہنا آج۔"

"مُجھے یقین ہے کہ جب میری پیاری بیٹی کو اِس کی وجہ معلوم ہوگی تو اُس کی ناراضگی فوراً ختم ہو جائے گی۔" بیگم صاحبہ نے مُسکراتے ہوئے بہو کو گلے لگا لیا اور کہا۔

ساس بہو میں باتیں ہو رہی تھیں کہ حمیدہ نے آ کر سلام کیا اور کہنے لگی۔

" بیگم صاحبہ تھوڑی دیر میں فریدہ کے رشتہ والے آجائیں گے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اُن کے آنے سے پہلے بیگم صاحبہ اور بہو بیگم کو سلام کر آؤں۔"

"تو کہاں ہے وہ؟ بُلاؤ نہ اُسے کمرے میں۔ فریدہ۔ اندر آجا بیٹی۔" بیگم صاحبہ بولیں۔

فریدہ نے اندر آکر بیگم صاحبہ اور بہو بیگم کو سلام کیا۔ بہو کی نظر فریدہ پر پڑی تو وہ حیران رہ گئی۔ اُس کی لائی ہوئی سِلک کا جوڑا فریدہ کے جسم پر تھا۔ بیگم صاحبہ نے فریدہ کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ "ماشا اللہ کیسی حسین لگ رہی ہے میری بیٹی۔ اللہ نصیب اچھّے کرے۔"

حمیدہ اور فریدہ واپس گئیں تو بہو نے کہا۔ "اچھّا تو یہ معاملہ ہے؟"

"بیٹی! نہ جانے مُجھے کیوں ایسا محسوس ہوا کہ یہ جوڑا اِس خاص موقع پر پہننے کے لیے فریدہ ہی کے لیے آیا تھا۔ بس کُچھ سوچے بغیر میں نے یہ حمیدہ کو

دے دیا۔ مُجھے یقین تھا کہ تُم ناراض نہیں ہو گی۔" بیگم صاحبہ مُسکراتے ہوئے بولیں۔

"امّی! آپ نے بہت اچھّا کیا۔ آپ کی خُوشی میں میری خُوشی ہے۔" بہو نے ساس کا ہاتھ محبّت سے چُومتے ہوئے کہا۔

بیگم صاحبہ نے زبان سے اور کچھ نہ کہا لیکن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پاک اُن کے ذہن میں گردش کر رہی تھی۔

حضور نے اپنی شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنّت میں اِس طرح نزدیک ہوں گے جس طرح یہ دو اُنگلیاں۔" (بخاری شریف)

نیک بخت

عارفہ خاتون ریڈیو سُنتے سُنتے اونگھ گئیں۔ ایک آدھ منٹ بعد آنکھ کھلی تو پروگرام میں کسی بچّے کی بات ہو رہی تھی جو بیمار تھا۔ عارفہ آدھے سوتے اور آدھے جاگتے میں بس اتنا سمجھ سکیں کہ اِس بچّے کو علاج کے لیے برطانیہ لے جانا ہے ضروری ورنہ اِس کی جان کو خطرہ رہے گا۔

عارفہ کُچھ دیر آنکھیں بند کیے سوچتی رہیں۔ عجیب عجیب خیال اُن کے دماغ

میں آتے رہے۔ یہ دُنیا کتنی دُکھی ہے۔ ہر طرف بیماری ہے، بھُوک ہے، غریبی ہے۔ ایک طرف دولت کی ریل پیل ہے اور دوسری طرف ننگے بھُوکے انسان۔ پھر وہ سوچنے لگیں کہ دُنیا کی اِس حالت کے لیے انسان خود کتنا قصوروار ہے۔ اگر لوگوں کے دِل میں دوسروں کا دُکھ درد ہو اور وہ اپنا فرض پہچانیں تو شاید دُنیا کی حالت بہتر ہو جائے۔ شاید نہیں بلکہ یقیناً ایسا ہو جائے گا۔ بس ذرا سی قُربانی کا جذبہ ہونا چاہیے۔

سوچتے سوچتے عارفہ نے اپنی وہیل چئیر کو آگے بڑھایا اور میز کے پاس پہنچ گئی۔ میز کی دراز سے اس نے اپنی بنک کی کتاب نکالی اور اُس میں کُچھ دیکھنے کے بعد واپس دراز میں رکھ دیا۔

پولیو کی بیماری کی وجہ سے عارفہ خاتون بچپن میں اپنے دونوں پیروں سے معذور ہو گئی تھیں۔ لیکن اُنھوں نے ہمّت نہیں ہاری۔ اچھی تعلیم بھی حاصل کی اور کالج میں پڑھاتی بھی رہیں۔ اُن کا دِل جانتا تھا کہ یہ پہاڑ جیسی

زندگی اُنھوں نے کس طرح گزاری۔ بس ساری بات ہمّت کی تھی۔ شاعر نے سچ کہا ہے:

ہمّت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

وہ کون سا عقدہ جو وا ہو نہیں سکتا

یعنی انسان ہمّت کر لے تو ساری مُشکلیں حل ہوتی جاتی ہیں۔

عارفہ خاتون اب ریٹائر ہو چکی تھیں۔ ماں باپ کب کے رُخصت ہو چُکے تھے۔ شادی ہوئی نہیں تھی۔ آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ پیسہ اُنھیں کُچھ ورثے میں ملا تھا اور کُچھ ملازمت میں بچایا۔ آرام سے زندگی گزر رہی تھیں۔ تنہائی کا مشغلہ ریڈیو سُننا، ٹیلی وژن دیکھنا، کتابیں پڑھنا، پڑھائی میں طالبِ علموں کی مدد کرنا اور پڑوسیوں سے ملنا جُلنا تھا۔ اِن مشغلوں میں وقت اچھی طرح گُزر جاتا تھا اور اُنھیں اکیلا پن محسوس نہ ہوتا تھا۔ پڑوسیوں سے دوستی تھی

لہٰذا کام کاج میں وہ لوگ اُن کی مدد کرتے دیتے تھے اور اُنھیں کوئی تکلیف نہ ہونے دیتے تھے۔

عارفہ خاتون تھوڑی دیر کے لیے پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ سوچتے سوچتے اُنھوں نے جلدی سے میز پر رکھا ہوا ٹیلی فون اپنی گود میں رکھ لیا اور ڈائریکٹری میں نمبر تلاش کرنے لگیں۔ پھر اُنھوں نے نمبر ملایا اور بولیں۔

"دیکھئے۔ آج کُچھ دیر پہلے ایک مریض بچّے کے بارے میں ریڈیو سے اپیل نشر ہوئی ہے۔ اگر میں نے صحیح سُنا ہے تو اس میں آپ کے ہسپتال کا نام بتایا گیا تھا۔ آپ کُچھ بتا سکتے ہیں؟"

"جی ہاں۔ آپ نے ٹھیک سُنا۔ بچّے کا نام رشید ہے اور وہ ڈاکٹر عظمی کے زیرِ علاج ہے۔ میں آپ کی بات ڈاکٹر صاحب سے کراتا ہوں۔" اُدھر سے جواب ملا۔

عارفہ خاتون نے شکریہ کہا اور انتظار کرنے لگیں۔ چند سیکنڈ بعد ٹیلی فون پر آواز آئی۔ "السّلامُ علیکم۔ میں ڈاکٹر عظمی بول رہا ہوں۔ فرمائیے؟"

"وعلیکم السّلام۔ ڈاکٹر صاحب میں اُس بچّے کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی ہوں جس کے لیے ریڈیو سے۔۔۔۔" عارفہ خاتون بولیں۔

ڈاکٹر عظمی بیچ میں بول پڑے۔ "اچھّا رشید کے بارے میں۔ جی۔ جی۔ ہاں آپ ضرور تشریف لائیے۔ کب آنا چاہتی ہیں۔ جی کل شام پانچ بجے۔ جی ٹھیک ہے۔"

عارفہ خاتون ڈاکٹر عظمی سے مل کر آئیں تو پھر سوچ میں پڑ گئیں۔ اُنھوں نے اپنے بنک کے حساب کتاب پر نظر ڈالی۔ بنک کے علاوہ جو رقم اور زیور تھا اُس کا حساب لگایا۔ بچّے کے علاج کا خرچ اتنا زیادہ تھا کہ وہ کُچھ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھیں کہ اپنے پاس سے کتنی رقم دیں۔ کبھی دِل کہتا "جتنی رقم ہے سب دے دو۔" پھر خیال آتا "جو زندگی باقی ہے وہ کیسے

گُزرے گی۔ پیشن تو کافی نہیں ہوگی۔" عارفہ خاتون نے خود اپنے آپ سے کہنا شروع کیا۔ "عارفہ! کیا ہو گیا ہے تمھیں؟ گھر تمہارا اپنا ہے۔ پنشن ہے۔ پھر بھی پیسے سے اتنی محبّت۔ اللہ پر بھروسہ کر کے اپنی زندگی گزار لی ہے اب جو تھوڑا سا وقت باقی ہے کیا اِس کے لیے اُس پر بھروسہ اور توکّل نہیں؟ تمھیں اندازہ ہے کہ معذوری کی زندگی گزارنا کتنا مُشکل ہے۔ اگر تمہاری کوشش سے رشید زندگی بھر کے لیے معذور ہونے سے بچ جائے تو یہ سودا مہنگا نہیں۔"

عارفہ خاتون نے آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسو رومال سے خشک کیے۔ اُن کا ذہن بالکل صاف تھا اور دِل ہلکا۔ اور پھر ڈاکٹر عظمی کا ٹیلی فون نمبر ملا کر اُنھوں نے اُنھیں اپنے فیصلہ سے آگاہ کر دیا۔

کافی دِن گزر گئے۔ ایک دِن اچانک عارفہ خاتون کی نظر اخبار پڑھتے ہوئے ڈاکٹر عظمی کے انٹرویو پر پڑی جس میں اُنھوں نے رشید کے کامیاب

آپریشن کا ذکر کرتے ہوئے عارفہ خاتون کی مالی امداد کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ اخبار عارفہ کے ہاتھ سے گر گیا اور اُنھوں نے نہایت تکلیف اور غُصّے کی حالت میں ڈاکٹر عظمی کا فون نمبر ملایا۔

"آپ نے پڑھ لیا وہ انٹرویو۔ پسند آیا آپ کو؟" ڈاکٹر عظمی خوش ہو کر بولے۔

"ڈاکٹر صاحب! مُجھے سخت رنج ہے کہ آپ کے اِس انٹرویو سے میرا ثُواب بہت کم ہو گیا کیونکہ اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ ایک ہاتھ دے تو دوسرے کو خبر تک نہ ہو۔ بلکہ حدیثوں میں تو یہاں تک ہے کہ جس نے لوگوں کو دِکھانے کے لیے خیرات کی اُس نے شرک کیا اور احسان جتانے والا جنّت میں نہیں جا سکتا۔ میں نے یہ کام اپنی شہرت کے لیے تو نہیں کیا تھا۔ اور پھر آپ نے رشید کے والدین کو بھی مُجھ سے شکایت کا موقع دیا کہ میں اُن پر احسان رکھ رہی ہوں۔" عارفہ خاتون نے اپنے غُصّہ کو ضبط کرتے

ہوئے کہا۔

"محترمہ۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ لیکن آپ کا ثواب کم کیوں ہوگا۔ غَلطی تو میری ہے۔ مُجھے انداز نہیں تھا کہ ہمارے درمیان ابھی ایسے لوگ موجود ہیں جو صرف اللہ کو خوش کرنے کے لیے نیکی کرتے ہیں۔ شُہرت کے لیے نہیں۔" ڈاکٹر عظمی نے شرمسار ہو کر کہا۔

والدین کی خدمت

آدھی رات گزر چکی تھی لیکن ماں کو کسی طرح نیند نہیں آرہی تھی۔ نیند آتی بھی کیسے۔ اُس کی تو کھانسی ہی نہیں رُک رہی تھی۔ شام سے جو کھانسی شروع ہوئی تو آدھی رات تک رُکنے کا نام نہ لیا۔ ماں کے کھانسنے سے رضوان کی آنکھ کھل گئی تھی لیکن وہ رضائی میں دُبکا پڑا تھا اور اُس میں اُٹھنے کی ہمّت نہیں تھی۔ سردی بھی تو کڑاکے کی پڑ رہی تھی۔

کُچھ دیر رضوان اسی طرح چُپ سادھے پڑا رہا لیکن جب ماں نے کھانسی کے ساتھ ساتھ درد سے کراہنا شروع کیا تو اُس نے رضائی اُتار پھینکی اور جلدی سے کوٹ پہن کر دروازے کی طرف بڑھا۔ ماں روتی رہی لیکن رضوان نہ رُکا اور یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ "ماں! میں ابھی آیا حکیم جی سے دوا لینے جا رہا ہوں۔"

رضوان حکیم جی کے پاس پہنچا تو وہ غافل سو رہے تھے۔ بڑی مُشکل سے اُنھیں جگایا۔ ماں کا حال بتایا۔ دوا بنوائی اور گاؤں کے کتّوں سے بچتا بچاتا گھر پہنچا تو کافی دیر ہو چُکی تھی۔ آہستہ سے دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ ماں کی آنکھ لگ گئی ہے۔ اُس نے ماں کو جگانا مناسب نہ سمجھا لیکن سوچنے لگا کہ ماں کو دوا دینا ضروری ہے تاکہ وہ جلدی سے ٹھیک ہو جائے۔ وہ دوا لے کر ماں کے پاس بیٹھ گیا۔ اُسے سردی بھی لگ رہی تھی اور نیند بھی آ رہی تھی لیکن وہ بیٹھا رہا اور نیند کو بھگانے کی کوشش

کرتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد ماں کو پھر کھانسی اُٹھی اور وہ جاگ گئی۔ اُس نے رضوان کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ "ارے میری جان! ایک تو تُم اتنی رات کو سخت سردی میں دوا لینے گئے اور پھر اب جاگ بھی رہے ہو۔ سوئے کیوں نہیں؟"

رضوان نے ماں کو دوا پلاتے ہوئے کہا۔ "ماں! میں سو تو جاتا لیکن دراصل مُجھے ایک بات یاد آ گئی جو میں نے ایک کتاب میں پڑھی تھی۔ تین آدمی سفر پر جا رہے تھے کہ اتنے میں زور کی بارش ہو گئی۔ بارش سے بچنے کے لیے وہ تینوں ایک غار میں بیٹھ گئے۔ ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک بڑا سا پتھر لڑھکتا ہوا آیا اور غار کے مُنہ پر آ کر رُک گیا۔ غار سے نکلنے کا راستہ بند ہو گیا۔ پتھر اتنا بھاری تھا کہ تینوں مل کر بھی اُسے نہ ہٹا سکے۔ پھر اُن تینوں نے اپنی اپنی زندگی میں جو سب سے اچھا کام کیا تھا اس کا واسطہ

دے کر اللہ تعالی سے دُعا کی تو یہ پتھرّ تھوڑا تھوڑا کر کے غار کے مُنہ سے ہٹ گیا۔ ان تینوں میں سے ایک آدمی نے یہ دُعا کی تھی :

"اے اللہ! میرے باپ بہت بُوڑھے تھے اور میرے بچّے بہت چھوٹے ۔ میں روز شام کو گھر لوٹتا تو پہلے اپنے ماں باپ کو اور پھر بچّوں کو اپنی بکریوں کا دودھ دوہ کر پلاتا تھا۔ ایک دِن مُجھے واپسی میں دیر ہوئی اور میں دودھ لے کر ماں باپ کے پاس گیا تو وہ سو چکے تھے۔ نہ میں نے اُنھیں جگانا مناسب سمجھا اور نہ میرا دِل چاہا کہ ماں باپ تو بھوکے رہیں اور میں بچّوں کو دُودھ پلا دوں ۔ میں والدین کے پاس اِس انتظار میں کھڑا رہا کہ شاید وہ جاگ جائیں یہاں تک کہ صُبح ہو گئ ۔ اے اللہ اگر تو مُجھے جانتا ہے کہ میں نے یہ کام تیری خوشی کے لیے کیا تھا تو میری مُشکل آسان کر دے ۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کی دُعا قبول فرمائی ۔ بس مُجھے یہ واقعہ یاد آیا تو میرا دِل نہیں چاہا کہ آپ کی نیند خراب کروں چاہے مُجھے ساری رات آپ کے

جا گنے کا انتظار کرنا پڑے۔ ماں! یہ بات ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام کو سُنائی تھی۔"

ماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اُس نے رضوان کو گلے سے لگا لیا۔ صبح سویرے حکیم جی رضوان کی ماں کا حال پوچھنے آئے تو کہنے لگے۔ "رات مُجھے رضوان پر بڑا ترس آیا۔ بڑے زور کی سردی تھی۔" اور پھر وہ پاس کھڑے ہوئے رضوان سے بولے۔ "بیٹا تُم نے بڑا اچھّا کام کیا۔ ماں کا اولاد پر بڑا حق ہے۔ میں تمھیں بتاؤں کہ ایک دفعہ ایک شخص حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور پوچھنے لگا۔ یارسول اللہ! یہ بتائیے کہ میرے سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟"

آپ نے جواب۔ "تمھاری ماں۔"

اُس نے پوچھا۔ "پھر کون ہے؟"

آپ نے پھر وہی جواب دیا۔ "تمہاری ماں۔"

اُس شخص نے پھر یہی سوال کیا اور تیسری بار بھی حضور ﷺ نے یہی جواب دیا۔ جب اُس نے چوتھی بار کہا کہ پھر کون تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ "تمہارا باپ۔"

"بیٹا! اِس سے اندازہ لگاؤ کہ والدین اور خاص طور سے ماں کا درجہ اللہ تعالیٰ اور ہمارے پیارے نبیؐ کی نظر میں کتنا اونچا ہے۔ خدمت کرو اپنی ماں کی اور جب ابّا شہر سے آیا کریں تو اُن کی بھی خدمت کیا کرو۔"

حکیم جی یہ کہہ کر ماں سے اُس کا حال پوچھنے لگے اور پھر جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ دروازے پر رُک کر اُنھوں نے رضوان کو دیکھا اور بولے۔ "ایک بات اور بتاؤں۔ ابھی ابھی یاد آئی ہے مجھے۔ ایک دفعہ ایک مسلمان حضور نبی کریمؐ سے جہاد کی اجازت لینے آیا۔ اُس کے والدین زندہ تھے۔ حضورؐ نے اُس سے فرمایا۔ تمھارا جہاد یہی ہے کہ والدین کی

خدمت کرو۔"

یہ کہہ کر حکیم جی تو چلے گئے اور رضوان ماں سے لپٹ کر بولا۔ "ماں! بس میرے لیے یہ دُعا کریں کہ میں ہمیشہ آپ کی اور ابّا کی اِسی طرح خدمت کرتا رہوں۔ اور ہاں یہ بھی کہ میں خوب علم حاصل کروں۔"

"خوب پڑھے لکھے بڑا آدمی بنے اور۔۔۔۔۔ اور چاند سی دُلہن آئے۔"

ماں یہ کہہ کر زور سے ہنسی اور رضوان شرما گیا۔

دادی کا گاؤں

فاطمہ اسکول کی چھٹیوں میں اکثر اپنی دادی کے پاس اُن کے گاؤں چلی جاتی تھی۔ فاطمہ کے ابّو اس گاؤں سے بہت دور ایک شہر میں پروفیسر تھے۔ فاطمہ کے دادا کا انتقال ہوا تو اس کے ابّو امّی بھائی اور خود فاطمہ نے دادی سے بہت کہا کہ وہ شہر میں ان کے ساتھ رہنے لگیں لیکن وہ ہرگز نہ مانیں۔ جب کوئی ان سے اصرار کرتا تو وہ یہی جواب دیتیں : "ارے بیٹا ساری عُمر اِسی بستی میں گزار دی۔ بیاہ کر ماں باپ کے گھر سے اسی جگہ آئی۔ یہاں

دُنیا کی خوشیاں ملیں۔ گاؤں والوں کی محبّت ملی۔ اپنوں اور غیروں کی ہمدردی ملی۔ اب کس طرح چھوڑ دوں اِسے۔ جانے کا سوچتی ہوں تو یہاں کی زمین پیر پکڑ لیتی ہے۔ دِل بیٹھنے لگتا ہے۔"

سب گھر والوں نے دادی کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اور اس بات پر سمجھوتہ ہوا کہ دادی اماں کبھی کبھی تھوڑے دنوں کے لیے شہر میں بچّوں کے ساتھ رہا کریں گی۔ کچھ عرصے تک دادی کے شہر جانے کا سِلسِلہ جاری رہا لیکن پھر اُن کی صحت خراب رہنے لگی اور اُن کے لیے سفر کرنا بہت مشکل ہو گیا۔ آخر ایک دِن پروفیسر صاحب گاؤں آئے اور اُنہوں نے ضِد باندھ لی کہ وہ اپنی ماں کو ساتھ لے کر ہی جائیں گے تاکہ گھر والے اُن کی اچھّی طرح دیکھ بھال کر سکیں اور کسی اچھّے ڈاکٹر سے ان کا علاج کرایا جا سکے۔

"ارے بیٹا! موت زندگی تو اللہ کے ہاتھ ہے۔ جتنی اُس نے تقدیر میں لکھ

دی ہے اتنے دِن جی لوں گی۔ رہی دیکھ بھال تو یہ سب میرے اپنے ہیں۔ پورا گاؤں میری خدمت کو دِل جان سے تیّار رہتا ہے۔" دادی امّاں بار بار کہتی رہیں۔

"امّاں! میں مانتا ہوں کہ موت زندگی اللہ کے ہاتھ ہے لیکن اگر احتیاط کے طور پر کسی اچھّے ڈاکٹر کو دکھائیں تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ اور پھر آپ ہمیں بھی تو خدمت کا موقع دیجئے۔ میرا دِل چاہتا ہے کہ آپ کی خود خدمت کروں۔ آپ اس نیکی سے مُجھے کیوں محروم کر رہی ہیں۔" پروفیسر صاحب اُنھیں سمجھانے لگے۔

اِس بار دادی کو ہتھیار ڈالنا پڑے اور وہ بیٹے کے ساتھ جانے پر رضا مند ہو گئیں۔ گاؤں والوں کو دادی کے جانے کا بے حد افسوس ہوا لیکن بے چارے کیا کر سکتے تھے۔ چُپکے ہو گئے۔

دادی گھر پہنچیں تو جیسے گھر میں رونق آ گئی۔ سب لوگ خوش تھے۔ فاطمہ

نے کمرے میں دادی کے لیے بستر لگایا تھا اور ایک الماری اُن کے کپڑوں اور سامان کے لیے وقف کر دی تھی۔ رات کو سب سو گئے لیکن دادی پوتی میں دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ فاطمہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد دادی سے سوال کرتی تھی۔ دادی! اب آپ مُجھے چھوڑ کر گاؤں تو نہیں جائیں گی؟"

"ہر گز نہیں۔ میں اپنی پیاری بیٹی کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی اور اگر گاؤں گئی بھی تو اپنی گڑیا کو ساتھ لے جاؤں گی۔" دادی امّاں بار بار یہ جواب دیتیں۔

دادی کو گاؤں چھوڑنے کا بہت رنج تھا لیکن وہ خاموشی سے شہر میں دِل لگانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اِدھر فاطمہ یُوں تو دادی کے آ جانے سے بے حد خوش تھی لیکن ایک بات اُس کے دِل میں کھٹکتی رہتی تھی اور وہ کُچھ رنجیدہ ہو جاتی تھی۔ بات دراصل یہ تھی کہ فاطمہ جب چھٹیوں میں

گاؤں جاتی تھی تو اُسے بڑا مزا آتا تھا۔ باغوں اور کھیتوں کی سیر، تازہ ہوا، جھولے، آٹے کی چکّی کی آواز اور بڑے بڑے تالاب۔ گاؤں کی ہر چیز اُسے بہت بھاتی تھی اور پھر اِن سب سے زیادہ اسے اُن باتوں میں مزا آتا تھا جو اُس کی دادی اور دادی کے پاس آنے والی عورتوں میں ہوتی تھی۔ اُن عورتوں کے ذریعہ دادی کو نہ صرف اپنے گاؤں بلکہ پاس پڑوس کی بستیوں کی خبریں بھی ملتی رہتی تھیں۔

"دادی! مُجھے آپ کے یہاں آنے کی تو بہت خُوشی ہے لیکن اس بات کا رنج ہے کہ اب میں بھی گاؤں نہیں جا سکوں گی۔" ایک دِن فاطمہ نے دادی سے کہا۔

"لو بھئی، یہ کیا بات ہوئی۔ بھلا تمھیں گاؤں جانے سے کون روک سکتا ہے؟ تمھارا جب دِل چاہے جاؤ۔ میں تمھارے ابّو سے کہہ دوں گی۔" دادی بولیں۔

"دادی! بات یہ ہے کہ جب آپ گاؤں میں نہیں ہوں گی تو پھر وہاں جانے کا کیا مزا۔" فاطمہ نے کُچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "بیٹی! تُم میری زندگی میں اور میرے مرنے کے بعد جب بھی گاؤں جاؤ گی مجھے وہاں موجود پاؤ گی۔" دادی نے مُسکرا کر کہا۔

فاطمہ بھی دادی کی بات سُن کر مُسکرا دی لیکن اس کی سمجھ میں کُچھ نہ آیا۔ اس نے دادی سے اور کُچھ نہیں پوچھا۔

دادی کے انتقال کو چھ مہینے گُزر چُکے تھے۔ ایک دِن دادی کی یاد نے فاطمہ کو بہت ستایا۔ وہ اب بڑی ہو چُکی تھی اور کالج میں پڑھتی تھی لیکن دادی کی اتنی یاد آئی کہ وہ بے اختیار رونے لگی۔ بالکل ننھے بچّوں کی طرح اور پھر یوں اچانک اس نے فیصلہ کیا کہ وہ دادی کے گاؤں جائے گی۔

فاطمہ گاؤں پہنچی تو ایسا لگا جیسے عید آگئی ہے۔ ہر ایک خوش تھا۔ ہر ایک فاطمہ کی خاطر کر رہا تھا۔ وہ لوگ اُسے دیکھ کر اِس لیے بھی بہت خوش تھے

کہ اُس کی صورت شکل، اُس کی بول چال اور اُس کی عادتیں سب اپنی دادی کی طرح تھیں۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد فاطمہ سب کی آنکھ بچا کر آم کے اُس لمبے چوڑے باغ کی طرف نکل گئی جو اُس کی دادی نے لگوایا تھا اور پھر اُسے گاؤں والوں کے لیے وقف کر دیا تھا کہ وہ اُس کے پھل کھائیں۔ کہلاتا تو یہ آم کا باغ تھا لیکن اِس میں اور پھلوں کے بھی درخت تھے۔ باغ میں کنواں بھی تھا جس کا پانی بہت میٹھا تھا۔

باغ کے باہر گاؤں والوں نے ایک تختی لگائی تھی جس پر حضرت انس بن مالکؓ کی روایت کی ہوئی حدیثِ مبارک لکھی ہوئی تھی۔

"حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی مسلمان درخت لگائے۔ پھر اُس سے کوئی انسان یا جانور کھائے تو لگانے والے کی طرف سے وہ صدقہ شمار ہوتا ہے اور اُسے اِس کا ثواب ملتا رہتا ہے۔"

فاطمہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر کر ستانے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں

دادی کی تصویر تھی اور کانوں میں دادی کا یہ جملہ گونج رہا تھا۔ "تُم میری زندگی میں یا میرے مرنے کے بعد جب بھی گاؤں جاؤگی مُجھے وہاں موجود پاؤگی۔"

فاطمہ اپنے آپ سے کہنے لگی۔ "دادی نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ لوگوں کی زبان پراُن کی نیکی اوراچھّائی کی باتیں۔ انسان کی بھلائی کے لیے لگایا ہوااُن کا باغ اُن کا بنایا ہوا کنواں اور تالاب اور گاؤں والوں کے دِل میں اُن کی یاد یہ سب اس کا ثبوت ہے کہ آج بھی دادی گاؤں میں موجود ہیں۔

جانوروں پر رحم

رشید اپنے ابّا کے ساتھ بازار جانے کے لیے گھر سے نکلا۔ ابھی تھوڑی دور ہی گیا ہو گا کہ اُس نے ایک کُتّے کو دیکھا جو سڑک کے ایک طرف آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ رشید کو شرارت سوجھی اور اُس نے قریب پڑا ہوا ایک چھوٹا سا پتھّر اُٹھا کر کُتّے کو مارا۔ پتھّر کُتّے کے سر پر لگا اور وہ بے چارا پیں پیں کرتا ہوا اپنی جگہ سے اُٹھا اور بھاگ کر دوسری جگہ بیٹھ گیا۔ رشید نے جلدی سے ایک اور پتھّر اُٹھا کر پھر کُتّے کو نشانہ بنایا۔ اِس بار ایسا لگا کہ کُتّے

کو زیادہ چوٹ آئی ہے۔ وہ شور مچاتا ہوا بھاگا اور کہیں بہت دُور چلا گیا۔

رشید کے ابّا نے اُس وقت تو رشید سے کُچھ نہ کہا لیکن جب وہ بازار سے خریداری کر کے گھر لوٹا تو ابّا نے رشید کو اپنے پاس بِٹھا لیا اور بولے۔ "رشید بیٹے! ایک دِن ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم اپنے صحابیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ دین کی باتیں ہو رہی تھیں۔ لوگ سوال کر رہے تھے اور حضور جواب دے رہے تھے۔ مسلمانوں کا یہی طریقہ تھا کہ وہ جب بھی نبی کریمؐ کے پاس بیٹھتے اُن سے سوال کرتے تھے اور جو جواب ملتا اُس کے مطابق کام کرتے تھے اور اپنی زندگی کو ڈھالتے تھے۔

باتوں باتوں میں جانوروں کے ساتھ سلوک کا ذکر آ گیا۔ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ ایک آدمی کہیں چلا جا رہا تھا۔ لمبا راستہ تھا۔ چلتے چلتے اُسے پیاس لگی۔ پیاس بہت زیادہ بڑھی تو اُسے ایک کنواں نظر آ گیا۔ وہ آدمی اُس کے اندر

اُترا اور اپنی پیاس بُجھائی۔ پانی پی کر جب وہ کنوئیں سے باہر نکلا تو اُس نے
دیکھا کہ ایک کتّا کنویں کے پاس کھڑا ہے۔ وہ کتّا بہت پیاسا تھا۔ ہانپ رہا
تھا اور اپنی پیاس بجھانے کے لیے گیلی مٹّی چاٹ رہا تھا۔ اُس آدمی کو کُتّے
پر ترس آیا اور وہ سوچنے لگا کہ اِس کُتّے کو بھی اتنی ہی پیاس لگی ہے جتنی
مُجھے لگی تھی۔ یہ سوچ کر وہ پھر کُنویں میں اُترا اور اپنے موزے میں پانی
بھرا۔ پانی سے بھرا موزہ لے کر وہ آدمی کُنوئیں سے باہر آیا اور اُسے کُتّے
کے مُنہ میں ڈال دیا۔ اِس طرح کُتّے کی پیاس بُجھ گئی۔ اللہ تعالی کو اُس
آدمی کی یہ بات اتنی پسند آئی کہ اُس نے اپنے اِس بندے کے گناہ بخش
دیے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ واقعہ سُنا چُکے تو کسی صحابی نے
پوچھا یا رسول اللہؐ! کیا جانوروں کے ساتھ احسان کرنے پر بھی ہمیں ثواب
ملتا ہے؟"

حضور نے فرمایا کہ تر جگر والے ہر جاندار کے ساتھ نیکی کرنے کا ثواب

ہے۔

رشید اپنے ابّا کی بات بڑے غور سے سُن رہا تھا۔ اُنھوں نے بات ختم کی تو وہ بولا۔ "ابّو! پھر تو ہمارے پیارے نبیؐ جانوروں پر بہت رحم کھاتے ہوں گے؟"

"بیٹا! نبی کریمؐ تو اللہ کی ساری مخلوق کے لیے رحمت بن کر اِس دُنیا میں آئے تھے۔ وہ جانوروں پر بھی رحم فرماتے تھے۔ ایک بار آپ کسی جگہ جا رہے تھے۔ ایک اونٹ کو دیکھا جو بھوک سے بے تاب تھا۔ آپ نے اُس کے مالک سے ناراض ہو کر فرمایا کیا تُم اِس جانور کے معاملہ میں اللہ سے نہیں ڈرتے؟" رشید کے ابّا نے جواب دیا۔

ایک دفعہ ایک صحابی کسی پرندے کے بچّے پکڑ لائے۔ اُن کی ماں بے قرار ہو کر صحابی کے سر پر منڈلانے لگی۔ حضورؐ کو معلوم ہوا تو آپ نے سختی سے تاکید کی کہ وہ صحابی چڑیا کے بچّے اُس جگہ واپس رکھ کر آئیں جہاں سے نکال

کرلائے تھے۔"

رشید اپنے ابّا کی باتیں سُنتا رہا۔ تھوڑی دیر میں وہ اُٹھ کر باورچی خانے کی طرف گیا اور پھر گھر سے باہر نکل گیا۔ واپس آیا تو اُس نے خُوشی خوشی ابّا کو بتایا ہوا میں نے کُتّے کو تلاش کرلیا اور اُسے روٹی بھی کھلادی۔

"شاباش میرے بیٹے۔ اب کسی جانور کو تنگ نہ کرنا بلکہ ہمیشہ اُن سے اچھّا سلوک کرنا۔" ابّا نے خوش ہو کر کہا۔

کچورا کے بابا جی

ہاشم نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی۔ "آ جاؤ بھائی۔ دروازہ کھُلا ہے۔"

ہاشم کمرے میں داخل ہوا تو بابا جی تخت پر لیٹے آرام کر رہے تھے۔ ہاشم کے سلام کے جواب میں بابا جی نے بڑے زور سے وعلیکم السّلام کہا اور اُٹھ کر ہاشم کو گلے لگا لیا۔ پھر اُسے تخت پر اپنے پاس بِٹھاتے ہوئے

بولے۔ "مُجھے تمھارے گاؤں آنے کی خبر مِل گئی تھی۔ انتظار ہی کر رہا تھا۔"

"بابا جی! میں فوراً آتا۔ لیکن امّی اپنے پاس سے اُٹھنے ہی نہیں دیتی تھی۔ بس باتیں کیے جا رہی تھیں۔" ہاشم نے جواب دیا۔

"ہاں بھئی آخر ماں ہے نا۔ ماں کا دِل بھلا کیسے بھر سکتا ہے اور پھر اِس بار تو تم آئے بھی بہت دِن کے بعد ہو۔" بابا جی نے مُسکرا کر کہا۔

"بابا جی! آپ کی صحت تو ٹھیک ہے نا؟" ہاشم نے بابا جی کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا:

"اُس مالک کا بڑا کرم ہے۔ بڑا احسان ہے بیٹا۔" بابا جی نے اُوپر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بابا جی پنجاب کے ضلع جہلم میں ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ لیکن

پچھلے تیس سال سے وہ شمالی علاقے کے اِس گاؤں میں رہ رہے تھے۔ یہ گاؤں اسکردو سے تیس پینتیس کلومیٹر دور کچُورا جھیل کے کنارے آباد ہے۔ کچُورا جھیل ٹراوٴٹ مچھلی کے لیے بہت مشہور ہے۔ اِس کے آس پاس بے شمار جڑی بوٹیاں اُگتی ہیں جن کی خوشبُو ہر طرف پھیلتی رہتی ہے۔ یہاں سیب اور خُوبانی کے درخت بھی خوب بہار دِکھاتے ہیں۔ جولائی اگست میں پھل پھُول سے لدے ہوئے یہ درخت بڑے خوب صورت لگتے ہیں۔ اِس علاقے کی دوسری مشہور جھیل سدپارہ ہے اور کُچھ فاصلہ پر کوہ غذر کا حسین علاقہ ہے جہاں کیمیائی اثر رکھنے والے چشموں کا پانی ہزاروں مریضوں کو صحت بخشتا ہے۔

بابا جی لاہور کے ایک ہسپتال میں ڈاکٹر تھے۔ بیوی بچّوں کے ساتھ گلگت اور اسکردو کی سیر کرنے آئے۔ اُنھیں یہ علاقہ بہت اچھّا لگا۔ اُنھوں نے یہ بھی دیکھا کہ اِن علاقوں میں علاج معالجے کی سہولت بہت کم ہے۔ اِس

اُنھوں نے کُچھ دِن کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ وہ اِس علاقہ میں آباد ہو جائیں گے۔ اُنھوں نے لاہور میں اپنی ملازمت چھوڑ دی اور اسکردو چلے آئے۔ اللہ نے اِتنا دیا تھا کہ یہاں آسانی سے گُزارا ہوتا رہا۔ اُنھوں نے بڑی سادہ زندگی اختیار کی اور اللہ کے بندوں کی خدمت میں لگ گئے۔ چھوٹے بڑے سب لوگ اب اُن کے اصلی نام کے بجائے اُنھیں بابا جی کے نام سے پکارنے لگے تھے۔ اُن کی نیکی، اُن کی ہمدردی اور سادگی کی وجہ سے ہر شخص اُن کی عزّت کرتا تھا۔

بابا جی کے بیٹے بڑے ہوئے تو تعلیم کے لیے لاہور چلے گئے اور پھر وہیں ملازم ہو گئے۔ بیٹے اور اُن کے بیوی بچّے ملنے آئے تو بڑا زور دیتے کہ وہ لاہور چلیں یا پھر اپنے گاؤں میں چل کر رہیں۔ لیکن بابا جی کچُورا سے کہیں اور جانے کو تیّار نہ تھے۔ ایک دِن کے لیے بھی نہیں۔

ہاشم کے دِل میں بابا جی کی عزّت اِس لیے بہت زیادہ تھی کہ اُنھوں نے

اِس علاقے کے لوگوں کی بے غرض خدمت کی تھی اور وہ اللہ کے بندوں سے محبّت اور اُن کی خدمت اپنا ایمان سمجھتے تھے۔ اِس بار ہاشم گاؤں آیا تو بابا جی اِسے کُچھ فکر مند سے لگے۔ اُس نے کئی مرتبہ وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن بابا جی ٹال گئے۔ آخر ایک دِن ہاشم پیچھے پڑ گیا تو بابا جی کو بتانا ہی پڑا۔

چار پانچ دِن پہلے بڑا بیٹا آیا تھا۔ اُس نے ایک قریبی عزیز کے بارے میں بتایا کہ وہ بہت بیمار ہے۔ دراصل میرے اِس عزیز نے میرے یہاں آنے کے بعد کچھ لوگوں سے مل ملا کر گاؤں میں میری زمین کے کُچھ حصّے پر قبضہ کر لیا تھا۔ اُس کی اِس بات سے میرا دِل بہت دُکھا۔ لیکن مقدمہ بازی میں پڑنے کے بجائے یہی طے کیا کہ اِن لوگوں سے دور رہوں اور کبھی نہ مِلوں۔ شروع شروع میں گاؤں کے لوگ مُجھے منانے آئے لیکن میں اپنے فیصلہ پر قائم رہا۔ اب بیٹے نے بتایا کہ وہ عزیز بہت بیمار ہے اور اُس

کی شدید خواہش ہے کہ مرنے سے پہلے مُجھ سے مل لے۔" بابا جی نے بتایا۔

"تو کیا آپ نے اِنکار کر دیا؟" ہاشم بیچ میں بول اُٹھا۔

"انکار کرنے ہی والا تھا لیکن عجیب اتّفاق ہے کہ جب بیٹے سے بات ہو رہی تھی تو مجھے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث یاد آ گئی جو میں نے بخاری شریف میں پڑھی تھی کہ بدلہ لینے والا صلہ رحمی کرنے والا نہیں بلکہ صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ اُس سے جب رشتہ توڑا جائے تو وہ اُسے جوڑے۔" بابا جی بولے۔

"تو پھر آپ اداس کیوں ہیں؟" ہاشم نے پوچھا۔

"اندازہ لگاؤ کہ آدمی جہاں تیس سال رہتا رہے اُس جگہ اور وہاں کے لوگوں سے اُسے کتنی محبّت ہو گئی ہو گی۔ سوچتا ہوں ایسا نہ ہو کہ گاؤں چلا جاؤں اور

پھر بچّوں اور رشتہ داروں کی محبّت واپس نہ آنے دے۔" بابا جی بولے۔

"واہ بابا جی۔ یہاں جو اتنے بچّے آپ کی شفقت کو ترسیں گے اُن کا آپ کو کوئی خیال نہیں؟ یہ بات ہے تو میں آپ کو جانے ہی نہیں دوں گا۔" ہاشم نے گھبرا کر کہا۔

بابا جی نے بڑی محبّت سے ہاشم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولے۔ "ٹھیک کہتے ہو بیٹا۔ تُم سب بھی تو میرے اپنے ہو۔ مُجھے واپس آنا ہی پڑے گا۔ اب یہ دُعا کرو کہ میں گاؤں پہنچوں تو میرا وہ عزیز زندہ سلامت ہو اور ہمارے سارے گلے شکوے دور ہو جائیں۔ ٹوٹے ہوئے رشتے جُڑ جائیں۔"

ہاشم نے بابا جی کا ہاتھ محبّت سے اپنے ہاتھ میں لیتے ہو۔ کہا "آمین۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کامیاب کرے۔"

غُصّہ کا پچھتاوا

ولی عہد بہادر دوستوں اور مُصاحبوں میں گھِرے ہوئے بیٹھے تھے۔ اُنھیں نہ صرف شکار کا شوق تھا بلکہ شکار کے قصّے سُننے سے بھی بے حد دِل چسپی تھی۔ اِس وقت بھی دوست احباب اُنھیں خوش کرنے کے لیے ایسے ایسے قصّے سُنا رہے تھے جن میں سچ کم اور جھوٹ بہت زیادہ تھا۔

یہ برِّ صغیر پاک و ہند پر انگریزوں کی حکومت کا دور تھا۔ انگریزوں نے مُلک

کے جاگیرداروں اور زمینداروں کو خوب نوازا تھا اور بہت سی ریاستوں کو زیادہ اختیار دے دیا تھا۔ یہ بات بھی ایک ایسی ہی ریاست کے ولی عہد کی ہے جِن کا نام شہزادہ خسرو تھا۔

شہزادہ خسرو دوستوں کی باتوں کے مزے لے رہے تھے کہ اتنے میں ایک خدمت گار چائے لے کر حاضر ہوا۔ اُس نے پہلے چائے شہزادہ کی خدمت میں پیش کی اور پھر اُن کے دوستوں کو پیش کرنے لگا۔ نہ جانے کِس طرح پیالی کے نیچے رکھی ہوئی طشتری اُس کے ہاتھ سے پھسلی اور زمین پر گِر کر ٹوٹ گئی۔

خوف سے خدمت گار کا رنگ پیلا پڑ گیا اور اِدھر شہزادے کے غُصّے کا پارہ ایسا چڑھا کہ اُنھوں نے خدمت گار کو سب کے سامنے خوب بُرا بھلا کہا۔ پھر بھی تسلّی نہ ہوئی تو داروغہ کو طلب کیا اور حُکم دیا کہ خدمت گار کی تنخواہ سے پورے سیٹ کی قیمت کاٹ لی جائے کیونکہ ایک طشتری کے ٹوٹنے سے

پورا سیٹ بے کار ہو گیا ہے۔ داروغہ نے بڑے ادب سے عرض کیا:

"حضورِ عالی! اِس غریب کی تنخواہ ہی کتنی ہے۔ اِس کی کئی تنخواہیں بھی کاٹ لی جائیں تو بھی اِس ولایتی سیٹ کی قیمت پوری نہ ہوگی۔"

شہزادہ کا غُصّہ بڑھ گیا اور اُنھوں نے داروغہ کو ڈانٹا۔ "جو حُکم دیا گیا ہے اُس کی تعمیل کی جائے۔"

داروغہ بے چارا کیا کرتا۔ اُسے غریب خدمت گار سے ہمدردی ضروری تھی لیکن اپنی نوکری بھی پیاری تھی۔ لہٰذا اس نے حُکم، کی تعمیل شروع کی۔ خدمت گار کے گھر میں فاقوں کی نوبت آ گئی۔ غریب آدمی مانگ تانگ کے بیوی بچّوں کا پیٹ بھرتا۔ دِن گُزرتے گئے لیکن نہ شہزادے کا غُصّہ ٹھنڈا ہوا اور نہ معافی کی کوئی صورت پیدا ہوئی۔

عید کے دِن شہزادہ خسرو اپنے ایک قریبی دوست کا مہمان تھا۔ اُن کے یہ

دوست جن کا نام امیر تھا خود بھی ایک بہت بڑے جاگیر دار کے بیٹے تھے اور سب اُنہیں چھوٹے سرکار کہتے تھے۔ شہزادہ خسرو اور چھوٹے سرکار کی دوستی بڑی پکّی تھی۔ بہت دنوں سے اِن کا طریقہ یہ تھا کہ وہ عید اکٹھّے مناتے تھے۔ ایک سال شہزادے کی ریاست میں اور دوسرے سال چھوٹے سرکار کی ریاست میں۔ اِس سال چھوٹے سرکار کی ریاست کی باری تھی۔ رات گئے تک دونوں دوستوں میں خوب باتیں ہوتی رہیں۔ ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ لطیفے ہوتے رہے۔ چھوٹے سرکار نے خدمت گار کو بتایا کہ وہ عید کے دن "کم خواب" کی نئی شیروانی پہنیں گے جو خاص اِس موقع کے لیے تیّار کی گئی ہے۔ اُنھوں نے حُکم دیا کہ صُبح نماز سے پہلے اُن کا جوڑا تیّار کر دیا جائے اور شیروانی پر اچھی استری کی جائے کہ ایک شکن بھی نہ دِکھائی دے۔

اُس زمانہ میں بجلی کی اِستری تو ہوتی نہیں تھی لہٰذا صُبح صبح خدمت گار نے

لوہے کی استری میں کوئلے دہکائے اور استری کرنے لگا۔ کم بختی جو آئی تو ایک چھوٹی سی چنگاری اِستری سے نکل کر شیروانی کی اوپر والی جیب کے پاس گری اور وہاں ایک بدنُما کالا سوراخ پڑگیا۔ یہ سوراخ بالکل سامنے تھا اور اِسے چھُپانا مُمکن نہیں تھا۔

چھوٹے سرکار نہا دھو کر غُسل خانے سے نکلے تو شیروانی طلب کی۔ خدمت گار شیروانی لے کر حاضر ہوا۔ اتنی دیر میں شہزادہ خسرو بھی اُن کے کمرے میں آ چُکے تھے اور دوسرے دوست احباب بھی عید گاہ جانے کے لیے چھوٹے سرکار کے پاس جمع تھے۔ چھوٹے سرکار نے خدمت گار پر نظر ڈالی تو اُس کی عجیب حالت دیکھی۔ وہ بید کی طرح تھر تھر کانپ رہا تھا۔ نظریں جھُکی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ ایسا گھبرایا ہوا تھا کہ سلام کرنا بھی بھول گیا۔

چھوٹے سرکار نے وجہ پوچھی تو اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے چلپے

ہوئے سوراخ کی طرف اشارہ کیا۔ شیروانی اُس نے کُرسی پر رکھی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے تو چھوٹے سرکار نے خدمت گار کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اُسے کچّا چبا جائیں گے لیکن دوسرے ہی لمحے اُنہوں نے اپنے غُصّے پر قابو پا لیا۔ ذرا دیر وہ خدمت گار کو دیکھتے رہے اور پھر آگے بڑھ کر اُنہوں نے پہلے اُس کے جُڑے ہوئے ہاتھ کھولے۔ اِس کے بعد کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ "جو ہوا سو ہوا۔ جاؤ اور جلدی سے کِسی اور شیروانی پر اِستری کر لاؤ۔ نماز کو دیر ہو رہی ہے۔"

شہزادہ خسرو کو چھوٹے سرکار کے رویّے پر بڑی حیرت ہوئی۔ اُس وقت تو وہ خاموش ہو گئے لیکن کُچھ دیر بعد راستے میں اُنہوں نے سوال کیا۔ "میرا خیال ہے واپسی پر آپ خدمت گار کو اُس کی کارگزاری پر انعام بھی دیں گے؟"

چھوٹے سرکار مُسکرائے اور بولے۔ "اسے انعام دوں یا نہ دوں لیکن نماز کے بعد اِس بات کے لیے اللہ تعالیٰ کا شکر ضرور ادا کروں گا کہ اُس نے میرے دِل کو ایمان و اطمینان سے بھر دیا۔"

"کیا مطلب؟" شہزادے نے سوال کیا۔

"حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایک بڑی مُستند حدیث ہے کہ جو شخص اپنا غُصّہ نکال لینے کی طاقت رکھتا ہو اور پھر ضبط کر جائے اُس کے دِل کو اللہ تعالیٰ ایمان و اطمینان سے بھر دیتا ہے۔"

شہزادہ خسرو کی آنکھوں کے سامنے اپنے خدمت گار کی شکل آ گئی۔ اُن کا جسم اللہ کے خوف سے کانپنے لگا۔ وہ چھوٹے سرکار سے کہنے لگے۔ "آپ نے میری بھی آنکھیں کھول دیں۔ دُعا کیجیے کہ اللہ میری غَلطی معاف کر کے میرا دِل بھی اطمینان سے بھر دے۔"

اور اُنھوں نے دِل میں ارادہ کیا کہ اپنی ریاست میں واپس پہنچتے ہی اپنے گناہ کی تلافی کریں گے۔

ختم شد